غلام عباس کا افسانہ ''حمام میں'': سمجھوتے کی صورتیں

ڈاکٹر عابد حسین سیال

Dr Abid Hussain Sial

ABSTRACT:

Ghulam Abbas is one of the major fiction writers of Urdu who is known for his characters and themes mainly focusing extraordinary aspects and angles of daily life. Since his characters mostly come from deprived and neglected class of the society, so they behave with an attitude of 'compromise' in their life. Willingly or unwillingly, they have to adjust with the situation. The article presents an analysis of "Hammam Main" - Abbas's famous short story, in this context.

غلام عباس اردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں کئی اعتبار سے جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے ہمارے آس پاس موجود عام زندگی کے ایسے کرداروں اور پہلوؤں کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو بظاہر زیادہ اجاگر نہیں ہیں۔ انھی پہلوؤں میں ایک رویہ جو اُن کے ہاں اصولِ حیات بن کر آتا ہے، مفاہمت کا ہے۔ ان کے افسانے قدم قدم پر احساس دلاتے ہیں کہ زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنے کے لیے انسان کی سمجھوتے کی راہ اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس مفاہمتی رویے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے عموماً جن کرداروں کو چُنا ہے وہ زندگی کے ایسے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، سمجھوتا جن کی مجبوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمجھوتا دراصل بے بسی کی ایک صورت ہے۔ غلام عباس کے اکثر افسانوں میں اس رویے کی جھلک موجود ہے تاہم جن افسانوں میں یہ بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے ان میں ''حمام میں''، ''سمجھوتہ''، ''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون''، ''ایک دردمند دِل'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بھی ''حمام میں'' اس حوالے سے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس میں مختلف کردار اپنی اپنی زندگی کی مختلف جہتوں میں سمجھوتے پر مجبور دکھائے گئے ہیں اور سمجھوتا ایک وقتی یا عبوری رویے کی بجائے ایک زندگی کے ایک لازمے کے طور پر اجاگر ہوتا نظر آتا ہے۔ قبولیت کے اس رویے کے بارے میں ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

> ''عباس کی جس مخصوص طرزِ احساس کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ان کی کہانیوں میں مختلف انداز

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سے ظاہر ہوئی ہے۔ جو تسلیم و رضا اور قبولیت عباس کے اپنے مزاج میں ہے، وہی ان کے کرداروں میں بھی نمایاں ہے۔ یہ کردار زندگی میں اپنی محرومیوں کے باوجود عموماً اپنے حال میں مست اور اپنی خود فریبیوں میں خوش رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ نہ اپنے آپ سے الجھتے ہیں نہ دوسروں سے دست و گریباں ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کا سہارا بن کر چلتے ہیں۔ اسے خوش اعتقادی کہیے یا کچھ اور مگر یہ حقیقت ہے کہ اپنے آپ سے مطمئن افراد کی جو افراط عباس کے افسانوں میں نظر آتی ہیں وہ کہیں اور مشکل ہی سے نظر آئے گی۔۔۔ ان کرداروں نے اپنی زندگیوں کو ہر رنگ میں قبول کر رکھا ہے۔ ان کی کشمکش بھی ایک داخلی سکون اور طمانیت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔''(۱)

''حمام میں'' غلام عباس کے ناقابلِ فراموش افسانوں میں سے ہے۔ یہ افسانہ فکری اور فنی ہر دو اعتبار سے نمایاں امتیازات کا حامل ہے۔ کرداروں کی ایک کہکشاں اس افسانے میں جھلملاتی نظر آتی ہے لیکن افسانے کا مجموعی تاثر ایسا ہے کہ یہ کردار ایک ہی وجود کے حصے معلوم ہوتے ہیں۔ مصنف نے بڑی ہنرمندی سے ان کرداروں کی زندگی کی عکاسی کی ہے جس میں قدم قدم پر ناگواریاں در آتی ہیں جن پر وہ کبھی تھوڑا کبھی زیادہ تلملاتے، جھنجھلاتے، سٹپٹاتے ہیں لیکن صحرائے زندگی میں دور دور تک کسی سائے کا نشان نہ پا کر پھر اسی خود فریبی میں پناہ لینے اور حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بقول محمد حسن عسکری:

'''حمام میں' کے کرداروں کے سارے ذہنی فریب خاک میں مل جاتے ہیں اور وہ صاف صاف اس کا اعلان کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان فریبوں کے بغیر انھیں اپنی زندگی ہی ناممکن نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ وہ اس شکست و ریخت کے احساس ہی کو اپنے شعور سے مٹانے کی فکر شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں زندگی کی چند تلخ حقیقتوں کو راستہ دینا پڑتا ہے اور وہ اپنے مطالبات میں ترمیم گوارا کر لیتے ہیں تاکہ زندہ رہ سکیں۔''(۲)

افسانے کا مرکزی کردار فرخندہ نامی ایک اٹھائیس سالہ عورت ہے جسے سب فرخ بھابی کہتے ہیں۔ دیگر اہم کرداروں میں محسن—عدیل ایک ناکام ناول نویس، بھٹناگر—ایک بیمہ ایجنٹ، ڈاکٹر ہمدانی—ایک نیم حکیم، دیپ کمار— تعلیم سے بھاگا ہوا ایک نوجوان، مولانا—شہر سے دور کسی مسجد کے سابق پیش امام، شکیبی— جلد ساز اور نوجوان انقلابی شاعر، قاسم— ٹرام کمپنی کا ایک ملازم اور افسانہ نویس شامل ہیں۔ دوسرا بنیادی کردار میر نوازش علی کا ہے جو فرخ بھابی اور اس کے دوستوں کی ایک خاص ڈگر پر چلتی ہوئی زندگی میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ ''حمام میں'' غلام عباس کے نسبتاً طویل افسانوں میں سے ایک ہے جس کی کہانی بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ فرخندہ اپنے خاوند کی جواں مرگی اور سسرالی رشتہ

داروں کی سختیوں سے تنگ آ کر ایک بڑھیا کے نوکری دلوانے کے وعدے پر شہر بھاگ آتی ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر اس کی ملاقات محسن عدیل سے ہوتی ہے جو اس مکار بڑھیا سے چھٹکارا دلانے کے ساتھ ساتھ اس کی رہائش، قسطوں پر سلائی مشین دلوانے اور کام کاج کے لیے ایک لڑکے کا انتظام بھی کر دیتا ہے۔ یوں وہ سٹیج تیار ہوتا ہے جس پر آگے چل کر پورا افسانہ ایک کھیل کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف کردار اپنے اپنے وقت پر داخل ہوتے ہیں اور افسانے کے عمل کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کردار زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں قدرِ مشترک اپنے اپنے شعبے میں ان کی ناکامی اور (اس کے نتیجے میں) مخدوش اقتصادی حالت ہے۔ محسن عدیل، ناکام ناول نویس؛ بھٹنا گر، ناکام بیمہ ایجنٹ؛ ڈاکٹر ہمدانی، ناکام طبیب؛ دیپ کمار، ناکام طالب علم؛ مولانا، ناکام مُلّا؛ شکیبی، ناکام شاعر؛ قاسم، ناکام افسانہ نویس ــــ غرض ہر کردار سماجی اور معاشی جدوجہد میں پیچھے رہ جانے والے طبقے کے پژمردہ چہرے کا ایک نقش ہے۔ سمجھوتا اور خود فریبی ان کرداروں کا وہ وصف ہے جو زندگی سے ان کا رابطہ بحال رکھے ہوئے ہے۔ بقول ندیم احمد:

> ''عباس کو انسانوں اور ان کی نفسیات سے دلچسپی ہے۔ ان کی تحقیق و تفتیش کا مرکز انسانی جبلّت کا وہ احساس ہے جو انسان کو فریب اور دھوکے کے سہارے جینے اور اسی یوٹوپیا میں مسلسل فریب کھاتے رہنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ کوشش سے کچھ ثابت نہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا طاقتور فریب غلام عباس کے یہاں زندگی کو سسٹم پسٹم ہی سہی، بحال رکھنے کا واحد ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ دھوکا کھانے کی صلاحیت اور ایک ہمہ گیر ذہنی فریب کا تجربہ ان کے زیادہ تر کرداروں کے یہاں تقریباً المیاتی شدت اختیار کر گیا ہے۔''(۳)

فرخ بھابی اور اس کے گھر برپا ہونے والی محفل ان سب دوستوں کی ذہنی و جذباتی آسودگی کا ایک سہارا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اپنے دل میں فرخ بھابی کے لیے دبی دبی چاہت بھی رکھتے ہیں لیکن اس کے اظہار نہ کرنے پر سمجھوتا کیے ہوئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کی نہیں ہو سکتی اور کسی ایک کی نہ ہوتے ہوئے ہی سب کی ہو سکتی ہے۔ ان کی یہ وابستگی اس وقت ذرا اور نمایاں ہوتی ہے جب وہ میر نوازش علی اور فرخ بھابی کے درمیان بڑھتے ہوئے التفات کو دیکھتے ہیں۔ میر نوازش علی ایک تعلقہ دار کے صاحبزادے اور مولانا کے ہم وطن ہیں اور مولانا ہی کے توسط سے فرخ بھابی اور اس کے دوستوں کی محفل میں داخل ہوتے ہیں۔ اس سے قبل کام کاج کرنے والا لڑکا فرخ بھابی کی سلائی مشین چرا کر بھاگ جاتا ہے اور وہ اس واحد ذریعۂ آمدن سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مختصر سی پونجی ختم ہونے پر کرایہ اور سلائی مشین کی قسط دینے کے لیے چھوٹا موٹا زیور اور گھر کے برتن بیچنے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس موڑ پر افسانے میں میر نوازش علی کا نمودار ہونا سمجھوتے کی کئی شکلوں کو سامنے لاتا ہے۔ فرخندہ کے دوستوں کو اپنی محفل میں میر صاحب کی بے جا مداخلت نہایت ناگوار گزرتی ہے لیکن فرخندہ کی

وجہ سے طوعاً و کرہاً وہ ان کا آنا جانا برداشت کر لیتے ہیں۔ میر صاحب فرخندہ کو قیمتی ساڑھی خرید کر دیتے ہیں تو وہ احتجاج کرتے ہیں اور فرخندہ سے ساڑھی واپس کرنے کا کہتے ہیں لیکن اس کے واپس نہ کرنے پر خاموش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرخندہ گھر سے باہر جا کر میر صاحب سے ملنا شروع کر دیتی ہے تو وہ بھانپ لیتے ہیں، آپس میں غصے کا اظہار کرتے ہیں، قطع تعلق کرنے کا سوچتے ہیں لیکن پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ غلام عباس سے بے بسی اور بالآخر سمجھوتے کی اس کیفیت کے مکالمے بہت عمدگی سے تخلیق کیے ہیں:

''پھر آخر اس کا کیا علاج کیا جائے؟'' بھٹا گر نے پوچھا۔

''علاج اس کا صرف ایک ہی ہے۔'' عدیل نے کہا۔ ''وہ یہ کہ ہم اس سے قطع تعلق کر لیں۔ اور یہاں کا آنا جانا بالکل چھوڑ دیں۔''

مگر فرخ بھابی اور اس کی محفل کے بغیر ان لوگوں کی اپنی زندگیاں اس قدر سونی سونی دکھائی دیں کہ ہر شخص ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اور گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔''(۴)

دوسری طرف فرخندہ کا اقدام بھی حالات سے سمجھوتے کی ایک صورت ہے۔ سلائی مشین کی چوری کے بعد اس کا کوئی ذریعۂ آمدن نہیں رہتا۔ اسے اس بات کا بھی اچھی طرح احساس ہے کہ اس کے دوست اپنے تمام تر خلوص کے باوجود اپنی مفلوک الحالی کے باعث اس کی مدد کرنے سے معذور ہیں۔ لہٰذا مجبوراً وہ اپنا آپ بیچنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک دن میر صاحب سے مل کر رات گئے واپس آتی ہے تو ٹھنڈے پانی سے غسل کرتی ہے۔ چند دن بعد پھر وہ رات دس بجے تک واپس نہیں آتی تو اس کے دوست اس انتہائی صورت سے بھی سمجھوتا کر لیتے ہیں اور اس کے آنے سے پہلے اس کے غسل کے لیے پانی گرم کرنے لگتے ہیں۔ افسانے کا اختتامیہ بہت ہنرمندی سے بُنا گیا ہے۔ محسن عدیل، مولانا سے پانی گرم کرنے کا کہتا ہے جو جھنجھلا کر اس کی وجہ دریافت کرتا ہے۔ اس کے بعد کا منظر اور مکالمہ مصنف کی افسانے کے فن پر حد درجہ گرفت کا غماز ہے:

''اس کا جواب سننے کے لیے مولانا ہی نہیں بلکہ محسن عدیل کے سارے ساتھی بھی ان ہی جیسا اشتیاق رکھتے تھے۔ چنانچہ بھٹا گر جو اکیلا ہی فرش پر بازی لگا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں تاش کا پتّا پکڑا کا پکڑا رہ گیا۔ دیپ کمار سراغ رسانی کا ایک انگریزی ناول پڑھ رہا تھا، اس کی نظریں پڑھتے پڑھتے آخری لفظ پر جم کر رہ گئیں اور اس کے کان محسن عدیل کی آواز پر لگ گئے۔ قاسم اور شکیبی پاس ہی بیٹھے نہ جانے کن تصورات میں غرق تھے۔ دونوں نے چونک کر پُرمعنی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں عدیل کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''بھئی تم نہیں سمجھتے۔'' آخر محسن عدیل نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے ایک سرگوشی سی بن گئی تھی۔ ''بات یہ ہے۔ اس وہ آئی تھیں نا رات کو۔ اور پھر غسل کیا تھا نا ٹھنڈے پانی

سے۔آج سردی بہت زیادہ ہے۔ میں نے سوچا۔ بے کار بیٹھے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو لگے ہاتھوں پانی ہی گرم کر دیں۔''

یہ کہتے کہتے اس نے پہلو بدلا۔اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔''(۵)

افسانے کا آخری جملہ ''اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں'' اس سے پہلے بھی اس افسانے میں آ چکا ہے اور مصنف نے اسے محسن عدیل کی عادت بتانے کی کوشش ہے۔اس سے پہلے اس نے یہ طرزِ عمل اس وقت اختیار کیا تھا جب میر نوازش علی نے کھانے کی دعوت کی۔ یہ اس کی طرف سے ناراضی، ایک طرح کے خاموش احتجاج، اور بالآخر سمجھوتے کے اظہار کی صورت ہے۔اور سمجھوتے کے اسی احساس پر افسانے کا اختتام اسے ہنگامی یا وقتی ردِعمل سے زیادہ طرزِ زیست بتاتا ہے۔فضیل جعفری لکھتے ہیں:

''غلام عباس یہ نہیں بتاتے کہ اس رات یا اس کے بعد فرخندہ گھر لوٹی یا نہیں، کیا وہ میر نوازش علی یا کسی اور کے ساتھ کہیں چلی گئی۔کیا اس نے شادی کر لی، وغیرہ۔ہاں اس کے سارے دوست کہانی ختم ہونے تک اسی گھر پر موجود رہتے ہیں۔اس کے باوجود کہ جو کچھ بھی ہوا وہ ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سبھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔''(۶)

ڈاکٹر فاروق عثمان نے اَن کہے رشتوں اور رابطوں کو نئی ترتیب کے ساتھ قبول کرنے کو ان کرداروں کی دلیری کہا ہے۔وہ اس آخری واقعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سب کا پول ایک چھوٹے سے حادثے سے ہی کھل جاتا ہے اصل حقیقت ایک دھماکے کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے.....اب اگر زندہ رہنا ہے تو رشتوں اور رابطوں کو ایک نئی ترتیب دینا ہوگی۔ان نئے رشتوں اور نئے رابطوں کی ترتیب نو کس حد تک تکلیف دہ ہوتی ہے اس کا اندازہ وہ اضطراب دلاتا ہے جو فرخ بھابھی اور دانش وروں کی ٹولی دونوں اپنی اپنی جگہ محسوس کرتے ہیں لیکن زندہ رہنے کے لئے قدیم روابط کی معزولی کے عذاب سے انہیں گزرنا پڑتا ہے۔افسانہ جس حقیقت کو سامنے لاتا ہے وہ یہی تو ہے کہ اس سے پہلے کہ سب کچھ بکھر جائے اس عذاب کو دلیری کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔''(۷)

بہر حال یہ اس طرزِ عمل کو دلیری کا نام دیا جائے یا بے بسی کا، ان کرداروں کے پاس اس کے علاوہ زندگی کی بچی کھچی رونق بحال رکھنے کا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ یہاں فرخندہ اور اس کے گھر کی ایک مماثلت مرزا رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' میں پیش گئے خانم کے نگار خانے سے بھی بنتی ہے۔ مرزا رسوا نے خانم کے نگار خانے کو امیر اور عیاش طبقے کی تصویر کشی کے لیے چُنا تھا۔نواب، امراء، ڈاکو غرض وہ لوگ کہ پیسہ جن کا مسئلہ نہیں اور عیاشی جن کی ترجیح ہے۔فرخندہ کے گھر پر بھی محفل موجود ہے لیکن

ان لوگوں کی جنھیں خوشحالی سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ مماثلت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہاں آنے والے سب لوگوں کی حیثیت اور حق ایک جیسا ہے اور اپنی اسی حیثیت کو پہچانتے اور تسلیم کرتے ہوئے فرخندہ کے دوست اس کے انتہائی اقدام سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، جاڑے کی چاندنی، سات رنگ، کراچی: اکتوبر ۱۹۶۰ء، ص ۶۰

۲۔ محمد حسن عسکری، غلام عباس کے افسانے مشمولہ: مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۳۔ ندیم احمد، تمہید، کلیات غلام عباس، کلکتہ، انڈیا: رہروانِ ادب، ۲۰۱۶ء، ص ۲۴

۴۔ غلام عباس، زندگی، نقاب، چہرے، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء، ص ۶۰

۵۔ ایضاً، ص ۹۱، ۹۲

۶۔ فضیل جعفری، غلام عباس کا افسانوی ادب، مشمولہ: کلیاتِ غلام عباس، مرتبہ: ندیم احمد، ص ۶۸

۷۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، غلام عباس کا افسانہ: حمام میں، مشمولہ: غلام عباس، فکر وفن، مرتبہ: ایم خالد فیاض، راولپنڈی: نقش گر پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۶